Oriental College Magazine, Vol.102, No. 02, Serial No. 384, 2026

ڈاکٹر خورشید رضوی کی مضمون نگاری
(آمیزہ کے تناظر میں)

زاہد منیر عامر، پی ایچ ڈی
رئیس کرسی اردو و پاکستان شناسی
دانشکدہ زبانہا و ادبیات خارجی، دانشگاہ تہران، ایران

Dr. Khurshid Rizvi's Essay Writing
(In the Context of "Ameezah")

Zahid Munir Amir, PhD
Chair of Urdu and Pakistani Studies
Faculty of Foreign Languages and Literatures
University of Tehran, Iran

Abstract

This article provides a critical and scholarly review of Dr. Khurshid Rizvi’s essay collection, *"Ameezah"* (2026). The author explores how the book skillfully integrates diverse genres, including character sketching, research-oriented travelogues, literary criticism, and translations. Through an analysis of various personality portraits, the study highlights that 'self-negation' and a deep affection for the subject are essential for impactful character sketching. Additionally, the article underscores Dr. Rizvi's profound command over Arabic, Persian, and English literatures, along with his ability to fuse Eastern and Western literary traditions. Ultimately, *"Ameezah"* reflects a refined sense of culture, grace, and academic responsibility, serving as an exemplary model for contemporary researchers.

Keywords:

Dr. Khurshid Rizvi, Ameezah, Essay Writing, Character Sketching, Travelogue, Literary Criticism.

میر تقی میر کا وہ شعر جس میں دلی کے کوچوں کو یاد کرتے ہوئے انھیں اوراق مصور قرار دیا گیا ہے آپ نے سنا ہو گا(۱) اور اس سے متعلق یہ نکتہ آرائی بھی کہ اس میں اوراق مصور میں واو مفتوح ہے یا مکسور، اس لیے کہ واو اگر مفتوح ہو تو مراد وہ اوراق ہوں گے جن پر تصویریں بنی ہوئی ہوں اور اگر بکسر ہو تو مراد تصویر بنانے والے کے اوراق ہوں گے۔ آپ کا موقف جو بھی ہو اس وقت ایک ایسے مصور کے اوراق آپ کے سامنے ہیں جن میں ہر ورق ہر صفحے پر اک خیال انگیز مضمون لو دے رہا ہے اور میر صاحب کے دیوان کا عرصہ اگر عرصہ محشر تھا تو اس مجموعے کا ہر صفحہ عرصہ حیات سے مملو ہے۔ زیر نظر کتاب سے پہلے ہمارے مخدوم مصنف جناب ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کے مضامین کے دو مجموعے سامنے آ چکے ہیں (۲) جن میں قارئین ان کی نثر کے چیدہ چیدہ نمونوں سے مستفید ہوئے لیکن قارئین کی ضیافت طبع کے لیے اب جو مجموعہ سامنے آیا ہے اس میں بہ یک وقت شخصیت نگاری کے نمونے بھی ہیں اور سفر نامے بھی، تحقیق و تنقید بھی ہے اور تراجم بھی، سب سے بڑھ کر عربی، فارسی اور انگریزی ادبیات کی وہ کہکشاں جو فاضل مصنف کی اپنی شخصیت کا ایک نادر وصف ہے اور جس نے پہلی بار اس مجموعہ مضامین میں ظہور کیا ہے، یوں کہ وہ بہ یک وقت سبع معلقات کے رمز آشنا بھی ہیں اور شاہنامہ فردوسی کے اسرار و رموز کی گرہ کشائی بھی کر سکتے ہیں۔ وہ جہاں ہمیں لارنس کی قبر اور گرے کے مدفن کی سیر کروا سکتے ہیں وہاں وہ آرتھر کونن ڈائل کی روحانیات کی نقاب کشائی بھی کر سکتے ہیں۔

اس کتاب کے متعدد مضامین شخصیات پر ہیں۔ سب سے پہلا مضمون جناب مصنف کے استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر صوفی محمد ضیا الحق صاحب کے بارے میں ہے۔ یہاں جذبے، علم اور عقیدت کی رفاقت نے خوب رنگ پیدا کیا ہے، فاضل مصنف کی معجز نما یادداشت اس پر مستزاد ہے۔ جن مناظر پر نصف صدی سے زیادہ کی گرد پڑ چکی ہے وہ جب ہمیں دکھاتے ہیں تو ان کا براق ذہن کسی مشاق مصور کی طرح منظر کی حیران کن تفصیلات کو روشن کرتا چلا جاتا ہے۔ اپنے استاد محترم ڈاکٹر صوفی محمد ضیا الحق صاحب سے پہلی ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے انھوں نے جو منظر کشی کی ہے اسے دیکھیے اور داد دیجیے کہ وہ ایک مرکزی کرسی پر اپنے گھریلو لباس کے اوپر کتھئی رنگ کا ایک منقش گاؤن پہنے ہوئے، جس کی کمر کی ڈوری سے خوب صورت پھندنے لٹک رہے تھے، تشریف فرما تھے۔ سامنے ایک نفیس میز، بائیں بازو کو ایک گھومنے والی شیلف جس میں کچھ کتابیں دھری تھیں۔ دائیں جانب حقہ جو ان کا ہمدم و دمساز تھا، میز پر ٹیبل لیمپ، ایک خوب صورت فریم میں کسا ہوا محدب عدسہ اور سلیقے سے رکھے ہوئے کچھ کاغذات اور سامنے میز کے تین

اطراف میں ملاقاتیوں کے لیے بید سے بُنی ہوئی بغیر بازو کی کرسیاں۔(۳) انھی کرسیوں میں سے ایک کا انتخاب کر کے یہ نووارد طالب علم کی حیثیت سے اس پر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر افادے اور استفادے کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جو تعلیم و تعلم کی دنیامیں ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کتاب سے پہلے شائع ہونے والے دو مجموعوں میں بھی شخصیت نگاری کے کچھ نمونوں سے ہم لطف اندوز ہو چکے ہیں بلکہ شخصیہ نگاری پر ایک مستقل کتاب بازدید کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ شخصیت نئی ہو یا پرانی اس سے متعارف کرواتے ہوئے فاضل مصنف کا قلم شخصیت کے پیکر کے نقوش یوں تراشتا ہے کہ جس نے انھیں نہیں دیکھا وہ بھی انھیں چشم تصور سے دیکھنے لگتا ہے گویا خود انھی کے بہ قول:

یوں تراشوں گا غزل میں تیرے پیکر کے نقوش
وہ بھی دیکھے گا تجھے جس نے تجھے دیکھا نہیں(۴)

شخصیات پر لکھے گئے مضامین اکثر و بیشتر خاکوں کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں، لیکن چونکہ لکھنے والا محض ناظر یا مصنف ہی نہیں ایک محقق بھی ہے اس لیے شخصیت سے تعارف کرواتے ہوئے قاری کو محض اپنے مشاہدے تک محدود رکھنے کی بجائے پورے منظر و پس منظر سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ مثال کے طور پر مولانا عظامی کا خاکہ لکھتے ہوئے مولانا کی پوری سوانح کو چند سطروں میں یوں سمو دیا گیا ہے کہ ان کی زندگی کے نشیب و فراز آئینہ ہو جاتے ہیں اور خاکہ سوانح عمری بننے کے بوجھ سے بھی محفوظ رہتا ہے۔ شخصی خاکہ ہلکے پھلکے انداز میں شخصیت کی تصویر روشن کرتا ہے تحقیقی مزاج کے باوصف خاکے کی یہ خوبی ان کی تحریر میں کیسے ظہور کرتی ہے مولانا عظامی ہی کے خاکے میں اس کی جلوہ نمائی یوں دیکھی جاسکتی ہے:

> ”نہایت دُبلے پتلے، رنگت گہری سانولی، سر پرُ ترکی ٹوپی، آنکھوں پر گول کمانی کا نظر کا چشمہ، رخساروں پر کھچڑی داڑھی، منہ میں بس دو چار ہی دانت، بر میں شیروانی، آڑا پاجامہ اور سلیم شاہی جوتی پہنے، ہاتھ میں خمیدہ دستی کی چھڑی لیے، چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتے پیدل اسکول آتے جاتے تھے۔ ایک خاص دھج یہ تھی کہ چُنا ہوا سفید دوپٹہ گلے میں آویزاں رہتا تھا۔ کبھی اس کے دونوں سرے پُشت پر لٹکے ہوتے اور کبھی شانوں سے ہوتے ہوئے اُن کے نحیف سینے پر۔ اسکول میں وہ ماسٹر عُظامی کے نام سے جانے جاتے تھے" (۵)

فاضل مصنف کا کہنا ہے کہ دنوں کی بھی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ یا شاید آدمی کے باطن میں کوئی نافہ ہوتا ہے جو اُسے باہر مہکتا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ۱۹۵۹ء میں اورینٹل کالج میں داخل ہوئے لیکن اُن دنوں

کی خوشبو آج بھی ان کے مشام جاں میں محفوظ ہے اور وہ یہاں کے در و دیوار کی سُرخی کو اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔ اپنی یادداشت کی جھیلوں میں ہلکورے لیتی یادوں کو کریدتے ہوئے قاری کو اپنے کلاس روم میں لے جاتے ہیں جہاں ان کے استاد سید ابو بکر غزنوی محو تدریس ہیں ،موضوع سخن خورشید الحسن کے نام میں عربی وفارسی کا وہ سنجوگ ہے جس سے نحویوں کو اتفاق نہیں، کلاس روم کا یہ منظر دیکھیے :

> " ”جب دارالماہی“ جاتا ہوں تو آپ یاد آجاتے ہیں اور جب آپ کو دیکھتا ہوں تو دارالماہی یاد آجاتا ہے۔ (اشارہ بھاٹی دروازے کے باہر ایک مشہور دکان کی طرف ہوتا جہاں تلی ہوئی مچھلی بکتی تھی اور اس کے نام میں ”ال“ کی وہی غلطی پائی جاتی تھی) اس پر کلاس میں ہنسی کا ہلکا سا ہمہمہ اُٹھتا تو وہی مکمّل مخارج کے ساتھ There is nothing to be laughed at کا رولر چلتا اور یہ غنچے بن کھلے ہی مرجھا جاتے"۔(۶)

اسی خاکے کا یہ حصہ دیکھیے جس میں کیسی خوبصورتی کے ساتھ ٹوٹی کو ٹوٹے ہوئے دانت سے ملادیا گیا ہے۔" عثمان غنی جو ہم سے ایک سال سینیئر تھے، اسلامیہ کالج ہی سے غزنوی صاحب کے شاگرد چلے آتے تھے۔ گاہے گاہے اُنہیں مخاطب کر کے ”تو بڑا ٹُوٹی ہے“ کہتے تو اس میں بلا کا پیار چُھپا ہوا ہوتا۔ بہت اچھے مُوڈ میں ہنستے تو سامنے کا ایک دانت جو ترچھے رُخ سے تھوڑا سا ٹوٹا ہوا تھا بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔"(۷)

خاکہ نگار کو کہانی کار کی طرح حقیقت میں آمیزشِ تخیل کی سہولت حاصل نہیں ہوتی، اسے تو مائیکل اینجلو کی طرح زوائد کو ہٹا کر سینہ سنگ میں موجود فن پارہ دریافت کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے موضوع کو محبت کی نگاہ سے نہ دیکھے تو زاویہ ہائے نگاہ کی عمومیت کے باعث پوشیدہ رہ جانے والے گوشوں کو دریافت نہیں کر سکتا۔ شیام لال کے خاکے " مرلی کی دھن" (۸) میں منٹو یا خود منٹو کے خاکے منٹو میرا دشمن" میں(۹) اوپندر ناتھ اشک کے رویے کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اپنے موضوع سے محبت کرتے ہیں، دوسرا فرق موضوع سخن بننے والی شخصیت پیدا کرتی ہے۔ پیش نظر کتاب کے خاکوں میں تہذیبی، تعلیمی اور ادبی شخصیات موضوع سخن ہیں اور ان کا تعارف کروانے والا خود ایک تہذیبی شخصیت ہے چنانچہ قاری ان خاکوں کو پڑھ کر عصمت چغتائی کے " دوزخی" (۱۰) کی طرح بدمزہ نہیں ہوتا بلکہ تہذیب وتمدن کے نکتے، علم وادب کی روشنی اور شائستگی کا ہنر سیکھتا ہے۔ سید ابو بکر غزنوی صاحب کا خاکہ اس کتاب کے بہترین خاکوں میں سے ہے۔ بنیادی خوبی اپنے موضوع کے ساتھ لکھنے والے کی محبت ہے جس کے

بغیر اچھا خاکہ لکھا ہی نہیں جا سکتا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے خاکے میں فاضل مصنف نے کہا ہے کہ "اُن کا بے ساختہ پن اُن کے علم سے بھی پہلے ہر نئے ملنے والے کو تسخیر کر لیتا تھا۔ وہ دوسروں پر اپنے علم کی پرچھائیاں ڈالنے کے بجائے دوسروں میں کوئی خوبی ڈھونڈ کر اُسی کی ایسی پذیرائی کرتے تھے کہ بس دلوں کو موہ لیتے تھے اور مسندِ محبت پر فائز ہو جاتے تھے جو احترام سے بلند تر مقام ہے"(۱۱)خود ان کے ہاں دوسروں کے لیے غایت درجہ احترام کی موجودگی قاری کو دل موہ لینے والے پہلوؤں سے محروم نہیں کرتی اور قاری موضوعِ سخن بننے والی شخصیت ہی سے نہیں بلکہ تعارف کروانے والے مصنف کی محبت میں بھی گرفتار ہوتا چلا جاتا ہے۔

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب سے ہمارے ڈاکٹر صاحب کو بہت گہرا لگاؤ تھا ہر ہفتے ملاقات ہوتی اور علم و ادب کے کتنے ہی نکات زیرِ بحث آتے۔ ان کے ساتھ محبت اس خاکے کی ہر ہر سطر میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ شیرانی صاحب نے آخری عمر میں خاکہ نگاری شروع کی اور اردو کو بہت اچھے خاکے عطا کیے۔ فاضل مصنف ان کی خاکہ نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں "مظہر محمود اتنا اچھا خاکہ کیسے لکھ لیتے تھے، اس کی بہت سی وجوہات میں سے ایک وجہ اُن کے ہاں نفیِ ذات کی صلاحیت تھی۔ اُن کی خودی راستے سے اُٹھ جاتی تھی۔ جب خاکہ لکھتے تو سراسر وہی کردار اُن کے قالب میں سمایا ہوا ہوتا اور تحریر میں بھی بس وہی نظر آتا۔ ہاں مظہر محمود فقط اُس ایک روزن سے دکھائی دیتے جس سے انہوں نے خود اس کردار کو دیکھا تھا"(۱۲)۔ یہ بات اگرچہ شیرانی صاحب کے خاکے میں برسبیل تذکرہ آ گئی ہے لیکن اس پر غور کیا جائے تو آپ اسے خاکہ نگاری کا منشور بھی کہہ سکتے ہیں گویا ایک اچھے خاکہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات سے بلند ہونے کا ہنر جانتا ہو جو اپنی ہی ذات کے اسیر ہوتے ہیں وہ اچھا خاکہ نہیں لکھ سکتے۔

وقت کے میزان میں وہی فن پارے زندہ رہتے ہیں جن میں زندگی کی حرارت اور فن کا حسن آمیز ہو، جن کے درون و بطون میں مظاہر فطرت کی جلوہ گری ہو، جو کسی تنقید یا اصلاح کے بوجھ سے آزاد زندگی کے حسن و حزن کا آمیزہ ہوں، فاضل مصنف کو اپنے دور طالب علمی میں ایسے جن فن پاروں تک رسائی ہوئی ان میں محمود ابو الوفا کی نظمیں "عاشقۃ القمر" (چاند کا عاشق) اور "عند ما یأتی المساء" (جب شام آتی ہے) بھی شامل تھیں جو مصر کے دو بلند پایہ مغنّیوں نے گائی بھی ہیں۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ "عند ما یأتی المساء" محمد عبد الوہاب نے ۱۹۳۸ء میں فلم "یحیا الحبّ" (محبت زندہ باد) کے لیے گائی۔ ۱۹۴۰ء میں ریاض السنباطی نے "عاشقۃ القمر" کو لندن ریڈیو سے گایا جو پہلے مصرع "یا نجمۃ فی سناک" کے بول سے مشہور

ہوئی۔ بعد کے زمانے میں سنباطی نے مزید پختہ دُھن بنا کر اسے دوبارہ بھی گایا۔ یہ دونوں نغمے انٹرنیٹ پر آج بھی سنے جا سکتے ہیں۔ بات یہاں ختم نہیں ہو جاتی، باریک نگاہ مصنف کی طبیعت پر مرتب ہونے والے تاثر کو ساٹھ پینسٹھ برس کے طویل شب و روز بھی محو نہیں کر پاتے اور ان کا ذوق بالآخر ان نظموں کے خالق محمود ابوالوفا کو اپنے ایک مضمون کا موضوع بنا ڈالتا ہے اور یہ تحقیق اردو قارئین کے لیے جدید عربی شاعری کے ایک اہم نمائندے سے واقفیت کا مفید ذریعہ بن جاتی ہے۔

اس کتاب کا ایک حصہ سفر ناموں پر مشتمل ہے یہاں آپ مصنف کی شخصیت میں علمی وجاہت کے ساتھ خوش طبعی اور ذوق جہاں بینی کے نمونے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس جہاں بینی میں آپ کو اقبال کے اس قول کے مظاہر بھی دکھائی دیں گے جس کے مطابق "جہاں بانی سے ہے دشوار تر کار جہاں بینی- جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا۔(۱۳)" "مدینہ خیبر اور مدائن صالح" کے عنوان سے جو تحریر اس کتاب کا حصہ ہے وہ اس بات کا ایک ثبوت ہے کہ کوئی موضوع کتنے زمانوں تک کسی مصنف کے ساتھ سفر کر سکتا ہے۔ فاضل مصنف ستر کی دہائی کے آغاز میں مدائن صالح کے آثار سے متعارف ہوئے جب انھیں پروفیسر نکلسن کی مشہور تصنیف A Literary History of the Arabs کے مطالعے کا موقع ملا(۱۴)۔ اس کتاب میں تذکرۂ عاد و ثمود کے تحت یہ کہا گیا تھا کہ قرآن کا یہ بیان کہ قومِ ثمود کے لوگ پہاڑوں میں گھر تراشا کرتے تھے۔ مدائن صالح کے پہاڑوں میں تراشیدہ حجروں کی حقیقت کے خلاف ہے جو، خود ان پر منقوش کتبات کی رُو سے، مقابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے قارئین کو بتاتے ہیں کہ پروفیسر نکلسن کے اس سرسری سے تبصرے نے جو بعد کے مطالعات کی روشنی میں سطحی اور عاجلانہ ثابت ہوا، میرے تجسس کو مہمیز کیا اور میں نے خود ڈائوٹی کو پڑھنا شروع کیا جس کی تحریروں پر نکلسن کے استدلال کا انحصار تھا۔ اردو کے قارئین کو ممنون ہونا چاہیے کہ فاضل مصنف نے ہمیں اس موضوع کے حوالے کام کرنے والے برطانوی سیاح اور مصنف سی ایم ڈائوٹی کی مساعی سے بھی متعارف کروا دیا انھوں نے بتایا کہ ڈائوٹی (C.M.Doughty 1843-1926) پہلے پٹرا پہنچا اور یہ معلوم ہونے پر کہ مدائنِ صالح میں بھی پٹرا سے مشابہ آثار پائے جاتے ہیں، ۱۸۷۶ء میں ایک کاروانِ حج کے ساتھ یہاں آیا اور پھر ان آثارِ قدیمہ کا مشاہدہ کرنے کے لیے بدّوؤں کے ساتھ یہیں فروکش رہا۔ اس نے کمال جانفشانی سے، اس زمانے میں، جب اُسے کیمرے کی سہولت بھی حاصل نہ تھی، اپنے قلم سے ان عمارتوں کے خاکے بنائے اور ان پر لکھے ہوئے کتبوں کی نقول تیار کر کے فرانس کے مشہور عالم ریناں (Ernest Renan 1823-92) کو

بھجوائے۔ ریناں کے کیے ہوئے فرانسیسی ترجمے کے مطابق یہ کتبات نبطی مقابر کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان پر درج تاریخیں تقویم عیسوی کے ابتدائی اسّی برس سے مطابقت رکھتی ہیں۔ جبکہ حضرت صالح علیہ السلام کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً پانچ سو برس پہلے کا سمجھا جاتا ہے۔ ڈاﺆٹی کی کتاب Travels in Arabia Deserta، ۱۸۸۸ میں دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس میں ان عمارتوں کے خاکے، کتبات کی نقول، ریناں کے فرانسیسی تراجم اور ڈاﺆٹی کے سفر اور مشاہدات کا نہایت تفصیلی بیان ملتا ہے۔

پروفیسر نکلسن اور چارلس ڈاﺆٹی کی کتابوں کے مطالعے نے فاضل مصنف کو مزید تحریک فراہم کی اور وہ اپنے دور کے اہل علم سے بھی اس سلسلے میں تبادلہ خیال کرتے رہے۔ وہ اہل علم جن سے انھوں نے اس سلسلے میں تبادلہ خیال کیا ان میں ڈاکٹر صوفی محمد ضیاء الحق صاحب، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ اور ڈاکٹر رانا احسان الٰہی صاحب جیسے اصحاب شامل تھے(۱۵) لیکن یہ سفر یہاں ختم نہیں ہوگیا ۱۹۷۰ پر چاردہائیوں گزرجانے کے بعد جیسے ہی انھیں موقع ملا وہ ۲۰۰۹ میں مدائن صالح جا پہنچے اور اس سفر کے ذریعے فقط اپنے ذہن میں جنم لینے والے سوالات کے جواب تلاش نہیں کیے، "مدینہ خیبر اور مدائن صالح" جیسے علمی و تحقیقی سفر نامے کی صورت میں اپنی اس جستجو میں قارئین کو بھی شریک کر لیا۔ چونکہ اس سفر کا محرک بنیادی طور پر ایک علمی سوال تھا اس لیے اس سفر نامے کی فضا پر اس کا اثر غالب ہے۔ یہ سفر نامہ پڑھ کر قاری مصنف کے ذوق تحقیق و تجسس کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تحقیق کا شعلہ اتنا بلند ہے کہ بعض مقامات پر تو قاری کی سانس پھول جاتی ہے لیکن مصنف کا رہوار تحقیق بگٹٹ سفر کرتا آگے بڑھتا رہتا ہے۔ ہماری جامعات میں اعلیٰ تعلیمی اسناد کے حصول کے لیے کار تحقیق میں مبتلا محققین کے لیے یہ مثال سرمہ بصیرت کا درجہ رکھتی ہے کہ ایک موضوع کس طرح برسوں تک ایک مصنف کے ساتھ سفر کرتا ہے اور زندگی کے دوسرے مشاغل اسے اپنے علمی سوالات سے غافل نہیں کر دیتے۔

بعض اوقات ان سطور کے راقم کو بھی اندرون وبیرون ملک جناب مصنف کے ساتھ اسفار کی سعادت حاصل ہوئی ہے، راقم نے، کہن سالی کے باوصف ان کے جذبہ سیاحت و تجسس کو جوان دیکھا ہے وہ جہاں تک جاسکتے ہیں اس سے گریز نہیں کرتے۔ مدائن صالح کے سفر میں ایک مقام پر جہاں گزرتی ہوئی عمر نے انھیں پہاڑ پر چڑھنے کی اجازت نہیں دی تو انھوں نے اسے اپنی شکست نہیں بننے دیا اور اپنے بیٹے عامر کو اس پہاڑ پر بھیج کر اس اوّلین اور ثقہ راوی کی لائی ہوئی تصاویر کے ذریعے وہاں کا بھید پالیا۔ اردن

میں پیٹرا کے سفر کے دوران جب ہم ارضی خزنہ دیکھ چکے تو ڈاکٹر صاحب سر کوہ واقع دَیر کو بھی دیکھنے کے جذبے سے سرشار تھے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے خر سواری سے بھی گریز نہیں کیا اس سے آگے کا حال اردن کے سفر نامے میں آپ خود دیکھیے گا(۱۶)۔

پیش نظر کتاب میں وہ آپ کو ایک کتاب شناس کے روپ میں بھی دکھائی دیں گے۔ علامہ اقبال کی طرح وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ دنیا میں ایسی کتابیں بہت کم لکھی جاتی ہیں جو اول تا آخر پڑھے جانے کے لائق ہوں لیکن انھیں جس کتاب پر اظہار خیال کرنا ہو وہ اسے تو ضرور اول تا آخر دیکھتے ہیں۔ پیش نظر کتاب میں محمد کاظم صاحب کی مضامین: عربی ادب میں مطالعے پر ان کا تبصرہ اس بات کا شاہد عادل ہے کہ کتاب کی کوئی خوبی ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہی۔ یہ ان کے قلم سے نکلنے والا پہلا تبصرہ ہے جو ہم تک پہنچا ہے، یہ اس زمانے کی یادگار ہے جب وہ سرگودھا میں تھے اور کاظم صاحب کی یہ کتاب انھیں احمد ندیم قاسمی صاحب نے بھجوائی تھی اور انھی کی فرمائش پر وہ اس کتاب پر تبصرہ کرنے کے لیے لاہور تشریف لائے اور پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام " ماہنامہ " میں ۲ دسمبر ۱۹۷۹ کو یہ تبصرہ نشر ہوا اور اسی سال احمد ندیم قاسمی صاحب کے رسالے فنون میں اشاعت پذیر بھی ہوا(۱۷)۔ اس تبصرے میں انھوں نے عربی پڑھنے والوں کے حوالے سے ڈپٹی نذیر احمد کا یہ قول زریں نقل کیا ہے "مبتدیان عربی خوان کو دیکھتا ہوں تو اس ستارہ شناس کو یاد کرتا ہوں جس کو منظور تھا کہ اجرامِ فلکی میں جو صنائع و بدائع قدرت مضمر ہیں ان کو دیکھے۔ مگر وہ دوربین کے کیل پرزوں کی ساخت میں ایسا محو ہوا کہ آسمان کی طرف نظر بھر کر بھی نہ دیکھ سکا۔"(۱۸) اس قول کے یہاں دوہرانے سے غرض یہ ہے کہ خود ہمارے مخدوم مصنف کی نظر کبھی اجرام فلکی سے نہیں ہٹتی وہ کتاب کے جوہر کو گرفت میں لینے میں کامیاب رہتے ہیں۔ وہ انتخاب موضوع ہو یا اخذ نتائج، ترجمہ متون ہو یا تجزیہ مطالب وہ کسی مرحلے پر کیل پرزوں کی ساخت میں نہیں الجھتے۔ یہ ایک نہایت جامع تبصرہ ہے جو تبصرے سے بڑھ کر خود ایک مقالے کی حدود میں داخل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اب اس تبصرے پر نصف صدی گزرنے کو ہے۔ نصف صدی پہلے کے اس تبصرے میں باریک نگاہی اور نکتہ آفرینی کا تو وہی عالم ہے جس سے ہم آج آشنا ہیں البتہ جذبہ تحسین کی فراوانی کی جگہ اب احتیاط نے لے لی ہے۔

ادبیات کی دنیا میں مشرق و مغرب کا امتزاج فاضل مصنف کی شخصیت اور علمی فتوحات کا ایک خاص پہلو ہے انھوں نے مغربی دنیا کے جن پہلوؤں سے ہمیں متعارف کروایا ہے ان میں یہ پہلو

نمایاں ہوئے بغیر نہیں رہاہے ۔ایس ٹی کولرج سے انگریزی ادبیات کے قارئین ہی نہیں ایک درجے میں اردو تنقید کے قارئین بھی آشنا ہیں اس کی مشہور نظم Kubla Khan کے بارے میں یہ بتاتے ہوئے کہ شاعرپر یہ نظم عالم رویامیں وارد ہوئی تھی اور بیدار ہونے پر دو تین سو مصرعوں کی مکمل نظم اسے یاد تھی جسے اس نے کاغذ قلم لے کر لکھناشروع کیا تھا کہ کسی نے دستک دے کر اسے باہر بلالیااوراوریوں نظم کافقط وہی حصہ ہم تک پہنچ سکاجو اس دستک سے پہلے لکھاجاچکا تھااس میں آٹھ دس مصرعوں سے زیادہ اضافہ نہ ہوسکا۔ اس واقعے کی مناسبت علامہ اقبال کی غزل ع "اپنی جولاں گاہ زیر آسماں سمجھا تھامیں " (۱۹)سے دکھائی ہے جس کا نزول ڈاکٹر تاثیر کی تحریک پر ہوااور یوں لگتا تھا کہ اب تخلیق کا یہ سیل رواں تھمنے والانہیں کہ اچانک ایک نووارد کی آمد نے اس فیضانی لمحے کا سلسلہ منقطع کر دیا۔(۲۰)

اسی طرح سائودے کی ایک نظم The Cataract of Lodore کے حوالے سے، جس کا منظوم اردوترجمہ اکبرالہ آبادی نے کیاہے ، (۲۱)فاضل مصنف کااقبال کی ساقی نامہ (۲۲)کو یاد کرنا اور اکبر کے اس ترجمے اور اقبال کی ساقی نامہ کی مماثلت کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ کہنا کہ "اقبال، اکبر کے بہت معتقد تھے۔ شعوری یاغیر شعوری طور پر آبِ روانِ لڈور اور خیالاتِ اکبر کازور ان کے "ساقی نامہ" میں بھی موج زن ہوا"(۲۳)اکبراوراقبال کے تقابلی مطالعہ کی ایک اور جہت کی جانب راہ نمائی کرتاہے۔ایسے قابل توجہ علمی وادبی نکات کے ساتھ جہاں کہیں زندگی کی لطافتیں دامن کش دل ہوتی ہیں وہ ان میں بھی قاری کو شریک کرتے ہیں جیسے شاعروں کے درمیان میں ویسٹ منسٹر ابی کے قدیم گرجامیں جاتے ہوئے جب یہ پتہ چلا کہ ایک آدمی کا ٹکٹ دس پائونڈ کاہے مگر ساٹھ سال سے زائد عمر والوں کو ٹکٹ سات پائونڈمیں ملے گاتواس پر ان کا یہ تبصرہ کہ " بڑھاپا اس روز بہت کام آیا اور جوانی کی قیمت صرف تین پائونڈ رہ گئی"(۲۴) قاری کے چہرے پر تبسم کی کرنیں بکھیر دیتاہے۔

ان مضامین اور سفرناموں کا ایک اورخوشگوارپہلویہ بھی ہے کہ ان میں ایسے مقامات بھی ہیں جوفاضل مصنف کے لیے شعری تحریک کاسامان بنے اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے شعری الہام سے بھی قارئین کو محروم نہیں رکھاگیا جیسے لیک ڈسٹرکٹ کی جھیلوں، سبزہ زاروں، پھولوں اور پرندوں کے چپ لگادینے والے حُسن کو دیکھ کر سرزد ہونے والی نظم(۲۵)یاگھوڑے کومرتبہ آدمیت پرفائز کرنے والے عنترہ بن شداد کے اشعار کاتاثر جس نے خود ایک اردو نظم کاروپ دھار لیاہے(۲۶)۔

ڈاکٹر خورشید رضوی تحقیق کے میدان میں سر بکف دکھائی دیں یا شخصیہ نگاری کی وادیاں قطع

کریں، تنقید کے نشیب و فراز سے گزریں یا ترجمہ کی کٹھنائیاں سہل کرتے دکھائی دیں ان کی شخصیت کا عکس ان کی ہر تحریر میں دکھائی دیتا ہے ،وہی شائستگی ،تہذیب، رکھ رکھائو اور احساس فرض جو انھیں کسی بھی اظہار کے وقت دیانت داری کے معیاروں سے سرموانحراف نہیں کرنے دیتا،ان کی ہر تحریر میں چمکتااور جھلکتادکھائی دیتا ہے۔ آج کے قاری ہی کو نہیں آج کے محققین اور مصنفین کو بھی اس روشنی کی اشد ضرورت ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) میر تقی میر کا شعر ہے:

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے　　　جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

کلیات میر ،مرتبہ:کلب علی خان فائق رام پوری، (لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۸۶ء)، جلد اول،۴۲۵ ۔

(۲) پہلا مجموعہ مضامین تالیف ۱۹۹۵ میں شہ تاج مطبوعات لاہور سے شائع ہوا اور دوسرا مجموعہ اطراف کے نام سے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی سے ڈاکٹر وحید قریشی مرحوم نے ۲۰۰۳ میں شائع کیا۔

(۳) ڈاکٹر خورشید رضوی، آمیزہ،(لاہور: قلم فاونڈیشن انٹر نیشنل ۲۰۲۶ء)،۲۲۔

(۴) خورشید رضوی،شاخ تنہا ، مشمولہ: کلیات خورشید رضوی یکجا،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز ۲۰۲۳ء)،۷۶۔

(۵) ڈاکٹر خورشید رضوی، آمیزہ، ۴۲،۴۱۔

(۶) ایضاً،۵۹۔

(۷) ایضاً،۵۹۔

(۸) سعادت حسن منٹو، مرلی کی دھن، مشمولہ: گنجے فرشتے،(لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۲ء)،۱۷۵۔۲۱۰۔

(۹) اوپندر ناتھ اشک، منٹو میرا دشمن، (حیدر آباد: جمشید کتاب گھر ۱۹۵۵ء)

(۱۰) عصمت چغتائی، دوزخی، مشمولہ: چراغ روشن ہیں، مرتبہ: عقیل عباس جعفری(عصمت چغتائی کے شاہکار خاکے)، (کراچی: اٹلانٹس پبلی کیشنز مئی ۲۰۱۶ء)،۳۵۔

(۱۱) ڈاکٹر خورشید رضوی، آمیزہ، ۷۹۔

(۱۲) ایضاً، ۸۴۔

(۱۳) اقبال، نظم طلوع اسلام بانگ درا،(لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز جون ۱۹۹۶ء)،۲۶۸۔

(14) Reynold A Nicholson A Literary History of the Arabs, (New York Charles Scribner's Sons Fifth Avenue 1907)

(۱۵) ڈاکٹر خورشید رضوی، آمیزہ، ۱۸۶،۱۸۷

(۱٦) متعلقہ اقتباس ملاحظہ ہو:"میرا گدھا شاید کسی زمانے میں سیاست دان رہ چکا تھا۔ وہ شطرنج کے فیل کی طرح ترچھی چال چلتا ہوا اس طرح ان دیو قامت ستونوں کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا کہ کسی بھی لمحے میرا گھٹنا ان سے ٹکرا کر کام سے جا سکتا تھا۔ لڑکا پیچھے سے بھاگا بھاگا آتا اور اسے راہِ راست پر لاتا مگر چند ہی لمحوں میں اُس کی کجروی پھر عود کر آتی۔ مستزاد یہ کہ زین اچھی طرح کسی ہوئی نہ تھی اور گدھے کی موجِ خرام کے ساتھ ساتھ اِدھر اُدھر ڈولتی تھی۔ جو اقوالِ زریں سن رکھتے تھے اُن میں ایک یہ بھی تھا کہ گدھے سے گرنے والے کو گھوڑے سے گرنے والے کی نسبت زیادہ چوٹ آتی ہے۔ چنانچہ ابھی ہم میدان ہی میں تھے کہ میں نے محسوس کر لیا کہ اس منجھے ہوئے سیاست دان گدھے پر آٹھ سو سیڑھیاں چڑھنا کسی طور مناسب نہ ہو گا۔ حرم کا راستہ ہوتا تو اور بات تھی ”دیر“ کی راہ میں ہڈیاں تڑوانے کا خطرہ مول لینا کہاں کی دانشمندی ہے۔ میں نے فی الفور صدائے فریاد بلند کی کہ گدھے کو روک لیا جائے۔ زاہد منیر عامر صاحب کسی ماہر خر سوار کی طرح گدھے کو اُڑاتے ہوئے کیمرہ تھامے ارد گرد کے مناظر کی تصویریں لینے میں مصروف تھے۔ میری حالت زار کو دیکھتے ہوئے انہوں نے یہ کمال کیا کہ گدھے کی دُم کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے اور مجھے کیمرے کے نشانے پر دھر لیا۔ مگر میری آواز میں حقیقی خوف کی کپکپاہٹ کو محسوس کرتے ہی انہوں نے ”ہالٹ“ بول دیا۔ سب گدھے روک لیے گئے اور یہ سفر موقوف ہوا۔ لڑکے نے ہمیں قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر ہم نے اُسے اُجرت ادا کر کے واپسی کی راہ اختیار کی۔ اُس نے اپنی دکان سے کچھ ماڈل بھی ہمارے ہاتھ فروخت کیے اور مجھے احترامِ فراواں کے ساتھ ایک چھوٹا سا ماڈل مفت عنایت کیا۔(آمیزہ۱۷۹،۱۷۸)

(۱۷) احمد ندیم قاسمی (مدیر)فنون لاہور ستمبر اکتوبر۱۹۷۹ء، ص۱۷۵۔۱٦۸۔

(۱۸) ڈاکٹر خورشید رضوی، آمیزہ، ۲۵۲۔

(۱۹) محمد اقبال، بالِ جبریل، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز جون۱۹۹٦ء)،۱۸۔

(۲۰) اس واقعے کی تفصیل کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر تاثیر کا مضمون" ایک فیضانی لمحے کی یاد" مشمولہ ملفوظات اقبال مرتبہ محمود نظامی لاہور: اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۷۷ اقبال اکادمی کی اس اشاعت پر حواشی و تعلیقات کے اضافے کے باعث، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا نام درج ہے۔ حقیقت میں یہ کتاب محمود نظامی کی مرتب کردہ ہے۔

(۲۱) دیکھیے نظم: روانی آب(۲٦ دسمبر ۱۸۹۱)اکبر الہ آبادی کلیات اکبر مرتبہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لاہور: الحمد پبلی کیشنز ۲۰۲۲ص۷۹۹۔۸۰۱

(۲۲) محمد اقبال "ساقی نامہ" بال جبریل، محولہ بالا ص ۱۲۲تا۱۲۹

(۲۳) ڈاکٹر خورشید رضوی، آمیزہ، ۱۲۴۔

(۲۴) ڈاکٹر خورشید رضوی، آمیزہ،۱۰۱۔

(۲۵) ڈاکٹر خورشید رضوی، آمیزہ،۱۱۵،۱۱۴۔

(۲٦) ڈاکٹر خورشید رضوی، آمیزہ، ص۲۷۷،۲۷٦۔

BIBLIOGRAPHY

- Ahmad Nsdeem Qasmi, (Editor) *Fanun*, (Lahore: September-October 1979)
- Akbar Ala Abadi, *Kulliyat-e Akbar*, (comp.) Khawaja Muhammad Zakria, (Lahore: Al-Hamd Publications, 2022)
- Allama Muhammad Iqbal, Bal-*e Jibreel*, (Lahore: Sheikh Ghulam Ali & Sons, 1996)
- Allama Muhammad Iqbal, Nazam Talu'a Islam *Bang-e Darah*, (Lahore: Sheikh Ghulam Ali & Sons, 1996)
- Asmat Chughtai, Dozkhi, (incl.) *Charagh Roshan Hain*, (comp.) Aqeel Abbas Jafri, (Karachi: Atlantas Publications, 2016)
- Dr. Khurshid Rizvi, *Ameezah*, (Lahore: Qalam Foundation International, 2026)
- Dr. Khurshid Rizvi, Shakh-e Tanha, (incl.) *Kulliyat-e Khurshid Rizvi yakja*, (Lahore: Al-Hamd Publicatios, 2023)
- Meer Taqi Meer, *Kulliyat-e Mir*, (comp.) Kalab Ali Khan Fa'aq Raampuri, (Lahore: Majlis-e Taraqqi-e Adab, 1986)
- Reynold A Nicholson A Literary History of the Arabs, (New York Charles Scribner's Sons Fifth Avenue 1907)
- Sa'adat Hasan Manto, Murli ki Dhon, (incl.) *Ganjey Farishtey*, (Lahore: Maktaba Jadeed, 1952)
- Upendar Nath Ashk, *Manto mera dushman*, (Haiderabad: Jamshed Kitab Ghar, 1955)

❖❖❖